

## تصادم قوانین کا اسلامی تصور اور عمل\*

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ

قانون کی ایک شاخ ہے جسے خالگی یا شخصی قانون میں الہام لک بھی کہتے ہیں اور ”تصادم قوانین“ بھی، اگرچہ تصادم قوانین اصل میں اس شعبہ علم کے ایک باب کا نام ہے، لیکن اس جزء کا کل پر بھی بلا احتیاط اطلاق عام طور سے ہوتا ہے، اس کی اہمیت میں روز بروز اسی تناسب سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جس تناسب سے دنیا کی خود مختار اور مقتدر قوموں میں خود اکتفائی کی جگہ باہمی احتیاج نیز شافتی نقطہ نظر سے روشن خیالی اور وسعت قلب بڑھ رہی ہے، اس علم میں زیادہ تر اجنبیوں کی قومیت اور ان کے مسائل شخصی اور ان پر اختیار سماحت سے بحث ہوتی ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ عمومی قانون میں الہام لک اور خالگی قانون میں الہام لک میں کوئی کامل حد فاصل نہیں قائم کی جاسکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض مسائل سے ان دونوں علموں میں بحث ہوتی ہے، غالباً یہی وجہ تھی کہ مسلمان فقہائے سلف نے ان دونوں سے الگ الگ ابواب میں بحث کرنے کے بجائے فقہ کی کتابوں میں ایک ہی باب میں دونوں کا ذکر مناسب خیال کیا تھا، لیکن ہماری موجودہ ضروریات کا تقاضا ہے کہ اس کی کوشش کی جائے کہ متعلقہ مواد کو چن کر الگ کر کے ایک مستقل شکل دینے کی سہی کی جائے، یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب لکھی جائے، اس موضوع پر مواد کی بھی کوئی کمی نہیں، لیکن آج کی صحبت میں صرف اس کے خط و خال پر عام روشناسی کافی ہوگی۔

میں نے یہاں ”اسلامی تصادم قوانین“ کی اصطلاح عمداً استعمال نہیں کی ہے، کیونکہ اس سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ مختلف مذاہب فقہ میں تصادم ہو، مثلاً ایک فرقہ مقدمہ سنی ہو اور دوسرا شیعہ، تو فیصلہ کس کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ یہاں میں اس سے زیادہ وسیع مفہوم سے بحث کرنا چاہتا ہوں، مسلمانوں کے تصور تصادم قوانین سے بحث کرتے وقت حسب ذیل قسم کے مسائل کا ذکر کرنا

۱۔ ”معارف“، جنوری ۱۹۸۶ء، شمارہ نمبر ۲، جلد ۵، دائرۃ المصنفین عظیم گڑھ، (انڈیا)

ہوگا:

- ۱۔ مسئلہ قومیت اور
  - ۲۔ متامنون یعنی امن لے کر ہمارے ملک میں عارضی طور سے آئے ہوئے غیر ملکیوں ہی سے بحث نہ ہوگی، بلکہ
  - ۳۔ تصادم قوانین سے،
- (الف) جب کہ ایک فرقہ مقدمہ مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہو۔
- (ب) جب کہ دونوں غیر مسلم ہوں لیکن الگ الگ ملتوں کے ہوں۔
- (ج) جب کہ فریقین مسلمان تو ہوں لیکن الگ الگ مذاہب فقہ کے پیرو ہوں۔
- (د) برپائے تبدیل دین۔۔۔ نیز
- ۴۔ اسلامی مملکت کی مسلم رعایا کی حیثیت سے بھی جب کہ وہ
- (الف) کسی دوسری اسلامی مملکت میں،
- (ب) کسی غیر مسلم مملکت میں ہوں،

ایک مختصر مضمون میں سرسری خاکے کے سوا اس پر تفصیلی بحث کی سمجھائش نہیں، اس کے علاوہ اس مضمون میں صرف رائج العقیدہ لوگوں کے خیالات سے بحث کی جائے گی۔ ان قدیم یا جدید رواجوں سے بحث نہ ہوگی جو مسلمانوں کی مملکتوں میں پائے تو جاتے ہوں لیکن جن کی اسلامی قانون اجازت نہ دیتا ہو۔

## (۱) قومیت

جس چیز کو آج کل ہم قومیت کی اصطلاح سے تبییر کرتے ہیں، اس کا آغاز خونی رشتہ سے ہوا ہوگا اور انسانی تمدن میں ترقی پر دیگر عوامل بھی سیاسی وحدتوں میں استحکام پیدا کرنے میں حصہ لیتے رہے ہوں گے۔ چنانچہ ہمیں جغرافی، سماںی، نسلی، رنگی، قبائلی اور دیگر عصبیوں سے سابقہ پڑتا ہے، اور مختلف زمانوں اور مختلف اقیمیوں میں انہی عصبیوں میں سے کسی نہ کسی کو قومیت کا اثر انداز اور علمی نام دیا جاتا رہا ہے، اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس قسم کا شعور ان سیاسی وحدتوں میں پایا جاتا رہا ہے۔

گھوارہ اسلام یعنی عرب میں بھی زمانہ جالمیت میں یہی چیز رہی ہوگی، یہ قدرت اللہی کا کرشمہ تھا کہ عرب کے قبائلیت زدہ علاقے کے سب سے زیادہ مغوروں اور خود پسند گروہ آبادی یعنی قریش کے ایک فرد کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس غرض کے لئے ہو کہ وہ پیغمبر اسلام کی حیثیت سے خدا

کی طرف سے یہ اعلان کرے کہ:

”لوگو! ہم نے تمہیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا، اور تمہیں قومیں اور قبیلے بنا لیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، لیکن یاد رہے کہ تم میں سے سب سے زیادہ محترم خدا کے پاس وہی ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ مقتنی ہو، بے شک خدا جانے والا اور باخبر ہے۔“ (قرآن مجید سورہ نمبر ۲۹، آیت ۱۳)

اس اعلان نے قومیت کے مسئلہ پر تصور انسانی میں ایک انقلاب اور ایک نئی مرکزیت پیدا کر دی، آیت بالا کو اسلامی نظریہ قومیت کا منشور اساسی قرار دیا جا سکتا ہے، اس پر عہد نبوی میں اور اس کے بعد سے آج تک ہر زمانہ میں عمل ہوتا رہا اور روزے زمین پر جہاں کہیں حلال کا پھریریا اڑاتا، اس کے معنی انسانوں میں مساوات اور پرہیزگار کے تقدیم کے رہے۔

اس بیان سے بعضوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام میں دین اور قومیت میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ دین کے وہ معنی جو آج کل یورپ میں لئے جاتے ہیں وہ مسلمانوں کا معہود وہی نہیں، اس لئے غالباً یہ کہنا محفوظ تر اور صحیح تر ہوگا کہ نسلی، جغرافی، انسانی یا کسی اور مروجہ مفہوم کی رشتہ داری نہیں بلکہ ایک ہی مطیع نظر یا تصور حیات میں شرکت وہ چیز ہے، جسے اسلامی نقطہ نظر سے قومیت خیال کیا جاتا ہے، کیونکہ اگر فہم دین سے مراد انسان اور اس کے خالق کے تعلقات ہیں تو اس معنی کے لحاظ سے اسلام کھنڈ ایک دین نہیں رہتا، بلکہ اس سے کہیں وسیع مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ اسلام اپنے پیروؤں کو ہر شعبہ حیات میں چاہے وہ روحانی ہو یا مادی و سماجی، مکمل رہنمائی کرتا اور قواعد و احکام بتاتا ہے، اس نقطہ نظر سے اسلام اس برہمیت کے خلاف بھی احتجاج تھا، جس کے مطابق نجات صرف ان لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو برہمنوں کے موروثی طبقے میں پیدا ہوں۔ اسلام اس میسیحیت کے خلاف بھی احتجاج تھا، جس کے لحاظ سے انسان فطرۃ گناہ گار ہے اور اپنے اعمال کے لئے انفرادی طور پر جواب دہ نہیں ہے، بلکہ اس کی نجات کے لئے کسی اور کو قربان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ اس مجوہیت اور مزدکیت اور بت پستی وغیرہ کے خلاف بھی احتجاج تھا جو انسانوں سے اس کا اختیار سلب کر لیتے ہوں۔

کوئی شخص اپنی نسلی قومیت کو اصولاً بدل نہیں سکتا، (زمانہ حال میں جو اختیار دیا جانے لگا ہے وہ ذیلی چیز ہے) اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی اصولاً اپنی یا لوئی یا رنگی قومیت کو بھی بدل سکے، چنانچہ ہندوستانی اور یورپی گو ایک ہی نسل سے سمجھے جاتے ہیں، لیکن جنوبی افریقیہ کی سیاستیں میں رنگ کا

فرق جو معنی رکھتا ہے وہ اس مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکتا ہے، کسی کے لئے اپنی لسانی قومیت کا بدل دینا بھی تقریباً اتنا ہی مشکل ہے، اگر آدم و حوا کے ایک ہی جوڑے کی اولاد میں دوبارہ اتحاد پیدا کرنا اور ان کے مرکز گریز روحانیات کو بھی ضمناً روکنا ہے تو اس کا ذریعہ اسلامی فقط نظر سے یہ ہے کہ قومیت کو ایک قدرتی حادثہ کی جگہ اختیاری چیز قرار دیا جائے، اور اسلام نے جس رشتہ کو قومیت کے لئے چنا ہے وہ ایمان یا تصور حیات ہے اس کے علاوہ دیگر اساس ہائے قومیت کے متعلق اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ:

”تمہارا زبانوں اور لوگوں میں اختلاف تو اس میں بے شک (خالق کے کمال کی) نشانیاں جانے والے لوگوں کے لئے ہیں“ (قرآن مجید سورہ نمبر ۳۰، آیت ۲۲)

ایمان کے سوا دیگر اساس ہائے قومیت اسلام کے نزدیک کوئی اور معنی نہیں رکھتیں، تقریباً ایک صفحہ پہلے جو آیت نقل کی گئی تھی، اس میں نسلی بنیاد کو اسلام نے ٹھکرا دیا تھا، یہاں لسانی اور لومنی فرق کو بہت ہی غیر اہم حیثیت پر پہنچا دیا گیا ہے اور انسان کے اختیار یا ایمان کی ہمہ گیر اہمیت پر زور دیتے ہوئے اسلام نے ایک طرح کا ”بنیادی عقیدہ“ (Basic faith) بھی مرتب کر دیا یعنی وہ کم سے کم چیز جس کا ماننا کسی پچے اور اچھے انسان کے لئے ضروری ہے اور جس کا قبول کرنا انسانوں کی اکثریت کے لئے آسان بھی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ:

”جو لوگ (محمد ﷺ کو وحی کی ہوئی چیزوں پر) ایمان لائے اور جو یہودی ہیں اور نصرانی اور صابئی--- جو بھی خدا پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے، تو یقیناً ایسے لوگوں کا بدله ان کے آقا کے پاس ملے گا، اور انہیں نہ کوئی خوف کرنا چاہئے اور نہ ہی وہ افسوس کریں گے۔“ (قرآن مجید نیز، ۶۲/۲، نیز ۶۵/۵)

لیکن ناظرین کو ایک چیز بتا دینی چاہئے ورنہ مجھ پر تاریخ سے ناواقف ہونے کا الزام لگایا جائے گا، میں جانتا ہوں کہ تاریخ اسلام میں خود مسلمانوں میں خاصے پرانے زمانہ سے سیاسی، ذیلی قومیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، ان کا آغاز شیعہ سنی اختلاف سے ہوا اور دیگر شاخوں کا پھوٹنا مخصوص وقت آنے کی بات تھی، کچھ عرصہ بعد تو خود راجح العقیدہ سنی ائمہ بھی تسلیم کرنے لگے کہ:

لأنَّ الظَّارِينَ فِي الْأَصْلِ مَا امْتَازُوا إِلَّا بِالْجَرَاءِ إِلَّا حُكْمًا وَ تَنْفِيزَ الْوَلَايَاتِ وَ كَذَلِكَ الْوَلَايَاتُ الْمُخْتَلِفَةُ فِي دَارِ الْإِسْلَامِ بَيْنَ مُلُوكِ الْإِسْلَامِ لَا تَمْتَازُ إِلَّا بِالْغَلْبَةِ وَ الْجَرَاءِ الْحُكْمَ.

(كتاب الاسرار للدبوسي ورق نمبر ۱۵۱ بـ مخطوطه كتب خانہ ولی الدین استانبول)

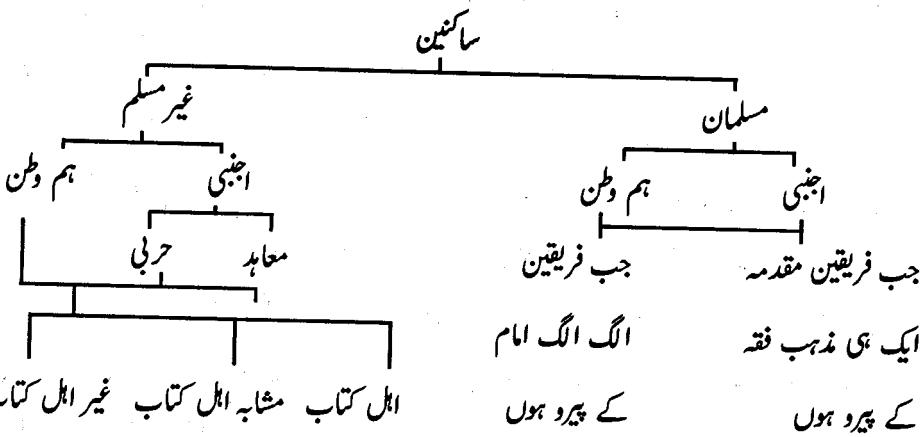
جس طرح دارالاسلام اور دارالحرب میں امتیاز احکام کا اجراء اور نفاذ اقتداء کے سوا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا، اسی طرح دارالاسلام کے اندر بھی مختلف علاقوں میں جو اسلامی بادشاہوں کے قبضہ میں ہوتے ہیں، تسلط اور اجرائے احکام ہی سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

یہ مشہور حنفی امام ابویزید الدبوی کا بیان ہے جن کی وفات ۳۳۰ھ میں خلافت عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی تھی، یہاں جس ذیلی تقسیم اور دارالاسلام کے تجربہ کا ذکر ہے، وہ بھی قومیت کے متعلق ذیلی انتخاب ہی کہا جا سکتا ہے، کوئی اہل اور قدرتی حادثہ نہیں کہا جا سکتا، میں شاید یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی بادشاہوں کے یہ اختلافات معمولی اور ضمیمی چیزیں یا گھریلو جھگڑے ہیں، نہ کہ ایک دوسرے سے جدائی اور علیحدگی و اجنیت۔

مجھے اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کہ جدید مغربی تمدن کے تصادم اور تمارس کے باعث اسلامی مبادیات قابل لحاظ حد تک متاثر ہوئی ہیں، اور حالات سے مجبور ہو کر وہ آج کل قومیت کے لئے ایسے قوانین وضع کر رہی ہیں جو ولادت اور سکونت پر مبنی ہیں، لیکن یہ اصل میں میں الہامالک زندگی کی سیاسی ضرورتیں اور انتظامیات ہیں جن کو میرے اس دعویٰ سے کوئی تضاد نہیں ہے کہ اسلامی تصور کے متعلق قومیت کے معنی ایمان میں اشتراک کے ہیں، ولادت یا رنگ، زبان یا وطن میں اشتراک کے نہیں)۔

اس لئے یہ دیکھ کر حیرت نہ ہونی چاہئے کہ انگلستان میں ایک عیسائی ملک ہونے کے باوجود بعض عیسائی اجنبی ہوں لیکن مسلمان شہری مانے جاتے ہوں، اس کے برخلاف افغانستان میں اجنبی افغانی حقوق شہریت سے بہرہ ور ہندوستانی مل سکیں (اگر مسلمان افغانستان میں اسلامی قانون قومیت نافذ ہو)۔

اسی لئے یہ بات قدرتی ہے کہ مسلمان فقہاء نے اس امر کے متعلق لمبی اور تفصیلی بحث کی ہے کہ ہم وطن اجنبیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے، یعنی ان ہم وطنوں سے جو حکمران جماعت سے ایمان و عقائد کے اختیاری مسئلہ میں اشتراک رکھنا پسند نہ کریں، اسی طرح کے ”ہم وطن اجنبیوں“ یا ان لوگوں کے جن کی حفاظت کا اسلامی حکومت ذمہ لیتی ہے (یعنی ذی یا اہل ذمہ) کے ساتھ برتاؤ کرنے کے متعلق جو قواعد پائے جاتے ہیں، ان کا تفصیلی ذکر اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، اسلامی مملکت کی سرزمین میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ عام طور پر حسب ذیل اقسام کے ہوتے ہیں:-



مسلمانوں میں باہم مکمل مساوات پائی جاتی ہے، اور اسلامی قانون میں کوئی طبقہ یا درجہ بندی تسلیم نہیں کی جاتی ہے، جملہ مسلمان ایک ہی امت یعنی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، چاہے وہ جہاں بھی ہوں، ایک ہی قانون کے وہ تابع ہوتے ہیں، جیسا کہ امام ابو یوسفؓ نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ ”المسلم ملتزم احکام الاسلام حیث ما کان“ (بحوالہ مبسوط سرخی ۹۵۱۰) لیکن قرآن نے یہ قرار دیا ہے کہ اسلامی مملکت ان مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہے، جو غیر مسلم علاقوں میں رہنا پسند کریں اور اسلامی عدالتیں بھی مسلمانوں کے افعال بلکہ مصائب پر جو بیرونی ممالک میں پیش آئیں، کوئی اختیار ساعت نہ تو جاتی ہیں اور نہ عمل میں لاتی ہیں۔

اس بچہ کی امت یا قومیت کا فیصلہ کرنے میں کچھ دشواری پیدا ہوتی ہے، جو لقیط یعنی کہیں پڑا ہوا مل جائے، یا اس کا باپ تو مسلمان ہو لیکن ماں غیر مسلمہ ہو یا باپ ذمی ہو اور ماں اجنبی یا حربیہ ہو اس سلسلہ میں اسلامی قانون نے یہ عام قاعدہ مقرر کیا ہے کہ بچہ اس امت کا سمجھا جائے گا جو اس کے حق میں مفید تر ہو، چنانچہ جو لقیط اسلامی سر زمین میں پایا جائے اور جس بچہ کا باپ مسلمان ہو وہ خود بھی مسلمان سمجھا جائے گا اور جس بچہ کے والدین میں سے ایک کا تعلق اہل ذمہ سے ہو، اور دوسرے کا اجنبی غیر مسلموں سے، تو بچہ ذمی یعنی اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعیت قرار دیا جائے گا، لیکن یاد رہے کہ یہ حضن بادی النظری قیاس ہوگا جس کی تردید ثبوت پیش کر کے کی جا سکے گی، اسلام ہر نمہب کے لوگوں کے ساتھ رواداری برداشت ہے اور ان کو رعیت بننے کی اجازت دیتا ہے، زبان، رنگ، نسل، دین کے کوئی امتیازات تسلیم نہیں کئے جاتے، صرف ایک چھوٹا سا استثناء ہے اسلام کے روحانی مرکز یعنی جزیرہ نما عرب میں مستقل سکونت کے متعلق کچھ پابندیاں ہیں کہ غیر مسلموں کو وہاں بننے کی اجازت نہ دی جائے، اس سیاسی و سماجی ضرورت سے قطع نظر، عیسائیوں، یہودیوں،

جو سیوں، بت پرستوں، کالوں، سانلوں، گوروں، سب ہی کو بطور ذی قبول کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اطاعت شعار رہ کر اسلامی سرزی میں سکونت اختیار کرنا چاہیں، چنانچہ امام ابو یوسف ”نے اپنی کتاب الخراج (ص ۳۷) میں صراحت سے بیان کیا ہے کہ ”مشرک، بت پرست، الٰ کتاب، آتش پرست، سنگ پرست اور دیگر تمام اقسام کے غیر مسلموں کو رعیت اور ذی بنایا جا سکتا ہے۔

غیر مسلم رعایا اور غیر مسلم اجانب میں بہر حال کچھ فرق پایا جاتا ہے، آخر الذکر کو اسلامی سرزی میں آنے کے لئے اقلًا امان یعنی اجازت نامہ حاصل کرنا ہوتا ہے، یہ اجازت حکومت ہی نہیں بلکہ ہر مسلم شہری حتیٰ کہ غلام اور عورتیں بھی عطا کر سکتی ہیں، اس طرح کا اجنبی غیر مسلم اسلامی سرزی میں اپنے قیام کے دوران میں امان نامے کے شرائط کے تابع ہوگا، لیکن اس سے قطع نظر وہ غیر مسلم رعایا ہی کے برابر حقوق و فرائض کا حامل ہوگا، ابتدأ امان کا حق ہر مسلم فرد کو حاصل سمجھا جاتا تھا، لیکن بعد کے فقہاء نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر حکومت چاہے تو صراحت سے اعلان کر کے اس عام حق کو عارضی طور پر معطل اور ایسی شرطیں عائد کر سکتی ہے جن کی تعمیل عام افراد کے لئے ضروری ہوگی۔

دورِ خلافت کی ابتدائی صدیوں میں غیر مسلم اجنبی کا قیام اسلامی سرزی میں زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لئے ہو سکتا تھا، اور اگر وہ اس سے زیادہ عرصہ تک رہنا چاہتا تو یہ تصور کر لیا جاتا کہ وہ توطن کا ارادہ رکھتا ہے اور اس پر وہی حاصل اور واجبات عائد کر دیئے جاتے جو غیر مسلم رعیت کے لئے مقرر ہیں، لیکن حالیہ زمانوں میں غیر ملکی ساکنین (جن کو اصطلاح میں مستامن کہا جاتا ہے) سیاسی وجوہ سے یہ چاہئے لگیں کہ طویل قیام کے باوجود اپنی سیاسی قویت برقرار رکھیں، اس کے مقنی مراعات خصوصی کے دور میں ترکی میں خاص کر امتیازی حیثیت رکھنے کے ہوتے تھے، چنانچہ اب سے کوئی چار سو سال قبل ۱۵۳۵ء میں ترکی اور فرانس میں یہ معاهدہ ہوا تھا کہ ایک سال کے بعدے دس سال سے زیادہ قیام پر غیر مسلم اجنبی کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ رعیت بنتا چاہتا ہے، مراعات خصوصی چونکہ ترکی کے سر جبرا تھوپے گئے تھے، اس لئے مسلمان فقہاء نے کبھی ان کو تسلیم نہیں کیا، اور اپنی کتابوں میں وہ آج تک بدلتے ہوئے حالات کے باوجود بھی لکھتے چلے آ رہے ہیں، کہ ایک سال سے زیادہ کا قیام رعیت بننے کے ارادہ کو ظاہر کرتا ہے۔

## (۲) غیر مسلم رعیت اور غیر مسلم اجانب کی حیثیت قانونی

اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعیت ذی کھلانی ہے، ذی بنا مسلمان فقہاء کی رائے کے مطابق ایک باضابطہ دو فریقی معاهدہ ہوتا ہے، جو رعیت بننے کے متینی غیر مسلم شخص اور اسلامی جماعت کے مابین عمل

میں آتا ہے، اگر ذمی وفاداری سے رہے اور مخصوص حفاظت جسے جزیہ کہتے ہیں، ادا کرتا رہے تو اسے سکونت کی آزادی ضمیر کی آزادی اور جان و مال و آبرو کی حفاظت حاصل ہوتی ہے، ذمی بننے کا معاهدہ حسب ذیل صورتوں میں ختم ہو جاتا ہے:

- ۱۔ بغاوت،
  - ۲۔ جزیہ کے وجوب سے ائکار،
  - ۳۔ حکومت کی اطاعت سے ائکار،
  - ۴۔ کسی آزاد مسلمان عورت سے زنا،
  - ۵۔ اسلامی ملکت کے کسی دشمن کو پناہ دینا، اور اس کے لئے جاسوسی کرنا،
  - ۶۔ خدا اور رسول اور خدا کی کتابوں کی بے حرمتی کرنا،
  - ۷۔ کسی مسلمان کو مرتد بنانا،
  - ۸۔ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی میں مشغول ہونا،
  - ۹۔ اسلام جن چیزوں کو اپنا امتیاز سمجھتا ہے اس کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرنا،
  - ۱۰۔ سودی کاروبار میں مشغول ہونا،
- اور اسی طرح کی چیزیں،

یہ امر البتہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ان میں سے بعض امور کی حد تک مختلف مذاہب فقہ میں اتفاق نہیں ہے، جن فقهاء کو اعلیٰ سرکاری خدمات کے سلسلہ میں عملی تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملا تھا، وہ بہ نسبت ان علماء کے جو درس گاہوں کے تخلیہ میں نظری خیال آرائی کرتے تھے، عام طور پر نرم تر رائے رکھتے ہیں۔

کسی مسلمان شہری کو سزا میں بھی اسلامی سرزی میں سے جلاوطن نہیں کیا جا سکتا، البتہ نظر بندی اور شہر بدری اس کے معارض نہیں، لیکن کسی غیر مسلم شہری کو نہ صرف سزا میں موت اور دوسری چھوٹی سزا میں دی جا سکتی ہیں، بلکہ اسے اسلامی سرزی میں سے ملک بدر بھی کیا جا سکتا ہے اگر وہ اپنی مفسدانہ سرگرمیوں کے باعث ایک ناپسندیدہ شخص بن گیا ہو۔

قرآن و حدیث کے احکام اور عہد نبوی سے لے کر اب تک ہر زمانہ میں متواتر و غیر منقطع رواج کے باعث اسلامی سرزی میں غیر مسلموں کو عدالتی خود مختاری حاصل رہی ہے، عیسائی یہودی اور دیگر ادیان کے پیروؤں کی الگ الگ عدالتیں قائم کی جاتی ہیں، جہاں انہی کے قوانین کا نفاذ انہی

کے ہم مذہب حکام عدالت کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے، البتہ یہ عدالتیں صرف اسی صورت میں کام دے سکتی ہیں، جب فریقین کا دین ایک ہی ہو، غیر مسلموں کو اس کی ممانعت نہیں کہ اپنا مقدمہ اگر خود چاہیں تو اپنی خوشی سے اپنی ملی عدالت کے ذریعہ اسلامی عدالت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اگر فریقین مقدمہ الگ الگ دین کے پیرو ہوں مثلاً ایک یہودی اور دوسرا عیسائی تو بھی غالباً اسلامی عدالت ہی میں رجوع ہونا پڑتا اور اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ عمل میں آتا لیکن اس بارے میں باوجود تلاش کے مجھے بھی تک کوئی تصریح اور تفصیل نہیں مل سکی، اگر فریقین ایک ہی دین کے پیرو ہوتے، اور اسلامی عدالت میں آتے تو آنحضرت ﷺ کا طرز عمل قتل اور زنا جیسے مقدمات میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ فریقین ہی کے شخصی قانون کے متعلق فیصلہ صادر کیا جائے جیسا کہ بخاری اور ابن حشام وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

مجھے بیہاں اختلافات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، جو غیر مسلم رعیت اور غیر مسلم اجانب کی شخصی حیثیت کے متعلق تصادم قوانین کے مختلف پہلوؤں میں پائے جاتے ہیں، البتہ چند نہایاں خصوصیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

مسلمان فقهاء یہ رائے رکھتے ہیں کہ ”اختلاف دین اور اختلاف دار“ وراثت کے منع ہوں گے، چنانچہ کوئی مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی عورت سے نکاح تو جائز طور پر کر سکتا ہے لیکن نہ تو ایسے شوہر کی وفات پر بیوی کو، اور نہ بیوی کی وفات پر شوہر کو ترکہ میں سے وراثت میں کوئی حصہ ملے گا، بلکہ پورا ترکہ متوفی فرد کے ہم دین قربی رشتہ داروں (باپ، ماں، بھائی، وغیرہ) میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور دوسرے دین کے پیرو رشتہ داروں کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، البتہ مرنے والا شخص اپنے رفیق زندگی یا دیگر رشتہ داروں کے لئے جو دوسرے دین کے پیرو ہوں وصیت ضرور کر سکتا ہے، وصیت ان لوگوں کے لئے بھی کی جاسکتی ہے جو غیر ملک کی سکونت اور غیر ملک کی رعیت ہونے کے باعث وراثت سے محروم ہو رہے ہوں، البتہ یہ وصیت جائز اغراض کے لئے ہونی چاہئے، چنانچہ ہمارے فقهاء بیان کرتے ہیں کہ مثلاً عیسائی بیوی کی یادگار میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے گرجا وغیرہ بنانے کے لئے مسلمان شوہر وصیت نہیں کر سکتا، وصیت اور وقف کے لئے غرض کا جائز ہونا ضروری ہوگا، صدقہ رحمی، پروردش، خیرات وغیرہ جائز اغراض سمجھے جائیں گے۔

محصول بچت یعنی زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر لگائی جاتی ہے لیکن اس سے استفادہ صرف مسلمان نہیں کرتے، چنانچہ علاوہ تعمیرات عامہ سڑکوں، سراؤں وغیرہ کے جو (مثلاً ابن اسبیل اور فی سبیل اللہ

کی مددوں کے تحت) تعمیر کئے جائیں گے، غیر مسلم استفادہ کر سکتے ہیں، خود حضرت عمرؓ کی مستند اور واجب التعیل تعبیر کے باعث قرآن مجید میں مصارف زکوٰۃ کی مددوں کے سلسلہ میں جو لفظ مساکین آیا ہے، اس میں غیر مسلم بھی شامل ہوتے ہیں۔ (مسلمانوں کے لئے فقراء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور لفظ مسکین کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ ایک ایسا اجنبی ہوتا ہے جو ہمارے علاقے میں سکونت رکھتا ہے، اسلامی سرزمین میں صرف غیر مسلم ہی مسکین ہو سکتا ہے) اور حضرت عمرؓ نے اسی تعمیر کے تحت یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے اسلامی خزانہ سے روزینے مقرر فرمائے، جیسا کہ امام ابو یوسفؓ نے کتاب الخراج میں تحریر فرمایا ہے، جو محصول غیر مسلموں سے ان کے ملی انتظامات کے تحت وصول کریں، وہ مختلف طبقت ہی کے افراد کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ یہاں شاید یہ بھی بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اسلامی سرزمین میں ہر شخص کی کھانے پینے اور رہنے سہنے کی ناگزیر ضرورتیں پوری کرنا حکومت کے فرائض میں داخل سمجھا گیا ہے۔ اس غرض کے لئے مسلمانوں سے عام طور پر بچت کا ڈھانی فی صدی سالانہ وصول کیا جاتا ہے، لیکن اگر اس کی آمدنی اور دیگر سرکاری آمدنی کافی ثابت نہ ہوں تو (جیسا کہ ابن حزم نے پوری تفصیل کے ساتھ اور مدلل لکھا ہے) اسلامی حکومت کو حق ہوتا ہے کہ مالداروں سے زکوٰۃ کے علاوہ زائد محصول بھی وصول کر سکتی ہے، جس کی حد امام ابن حزم نے یہ بتائی ہے کہ سدرست چھوڑ کر باقی ہر چیز جبراً تکمیل میں وصول کر لی جاسکتی ہے تاکہ ضرورت پر ملک کے بھوکوں اور نگلوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں، البتہ یہ اختیاری اور ضرورت کی چیز ہے، لازمی اور ہمیشہ عادت کی نہیں۔

انصاف کا بلند تصور خلقی فقهاء کو اس رائے پر آمادہ کرنے کا باعث بنا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو عمداً قتل کر دے تو قاتل کو سزاۓ موت دی جائے گی، (اگرچہ بعض دیگر ائمہ اس سے اختلاف کرتے ہیں لیکن خفیوں کے ہاں اپنی تائید میں ایک صریح حدیث نبوی موجود ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ دنیاۓ اسلام میں خفیوں کی تعداد اسی نوے فی صدی سے کم نہیں سمجھی جاسکتی ہے)۔

حکومت کے عہدوں پر غیر مسلموں کے تقریر کی ممانعت میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے کا ایک واقعہ مخالفوں کے لئے ایک بڑا بہانہ بنا رہا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک عامل گوزر کو حکم دیا تھا کہ اپنے کاتب (پرانی بیٹت سیکریٹری) کو فواً اس کی خدمت سے الگ کر دے، تحقیق پر واقعہ یوں معلوم ہوا ہے کہ اس کاتب کی جو عیسائی تھا، عربی بہت کمزور تھی، اور وہ سرکاری مرسلوں میں صرفی دنخوبی غلطیاں کرتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس ذمہ دار خدمت کے لئے زیادہ قابل اشخاص کی ضرورت تھی، اگر حضرت عمرؓ نے محض غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بھی علیحدہ کیا ہوتا تو بھی

آپ حق بجانب ہوتے، کیونکہ اپنے زمانہ میں جب کہ اسلامی فتوحات کو شروع ہوئے چند سال سے زیادہ نہیں گزرے تھے، اہم ذمہ دار عہدوں پر غیر مسلموں کا تقرر خاص کر ایسے علاقے میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بے حد قلیل تھی، یقیناً ہزاروں خرایوں کا باعث ہوتی، (اور آج چودھویں صدی ہجری میں بھی مغرب کی روشن خیال سے روشن خیال حکومتیں بھی اپنی نوآبادیوں میں اہم عہدوں کے متعلق جس قسم کی اجارہ داری برقرار ہیں اس کی موجودگی میں ہمیں کسی مذمت یا ندامت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا ایک واقعہ سے قطع نظر حضرت عمرؓ کے زمانہ کا کوئی اور واقعہ ہم کو نہیں ملتا جس میں غیر مسلموں کو سرکاری ملازمت سے الگ رکھا گیا ہو بلکہ اس کے بخلاف قریب قریب پورا حکمہ مالکواری اور بعض دوسرے حکمے غیر مسلموں ہی کا اجارہ رہے اور ہزاروں عیسائی، یہودی اور پارسی وغیرہ انتہائی اعتقاد اور ذمہ داری کے عہدوں پر خود حضرت عمرؓ اور بعد کے زمانوں میں مامور رہے، حتیٰ کہ دفتری زبان بھی ذائقہ عربوں نے عربی کی جگہ مالکواری وغیرہ کے حکمومیں فارسی، یونانی وغیرہ ہی رہنے دی اور یہ بھی حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک یہودی--- کی کچھ زمین جبرا خرید کر وہاں مسجد تعمیر کی تو اس کی اطلاع ملنے اور شکایت موصول ہونے پر حضرت عمرؓ نے فوراً وہ مسجد توڑوا دی اور زمین یہودی کو واپس دلوا دی۔ چنانچہ اس جگہ ”بیت یہودی“ آج تک پایا جاتا ہے، جیسا کہ لبنان کے ایک سابق وزیر عدالت شکری کرواہی نے جو ایک عیسائی ہے بیان کیا ہے۔

اگرچہ غیر مسلم رعایا کو جاز میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، لیکن خود حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلموں کو مکہ اور مدینہ میں مسجدوں کے اندر خلیفہ کے خطبہ کے وقت شکایتیں پیش کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، اور اس میں کوئی ممانعت اور رکاوٹ عدم نہیں کی جاسکتی تھی، اس قسم کے متعدد واقعات اور ان کا فوری تسویہ تاریخوں نے محفوظ رکھا ہے۔

اسلامی اصول یہ ہے کہ لا اکرَاهٗ فِي الدِّينِ یعنی کسی کو اس کی مرضی کے خلاف دوسرے دین کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور جس طرح کا حکم یمن میں اسلام سے پہلے ایک مرتبہ نجراں عیسائی حکمرانوں نے دیا تھا کہ کوئی یہودی عورت کسی عیسائی کے سوا دوسرے سے خاص کر یہودیوں سے نکاح نہیں کر سکتی تاکہ یہودیت ایک ہی نسل میں ناپید ہو جائے جیسا کہ مشہور فرانسیسی مورخ دے جنس (Desvegens) نے بیان کیا ہے، اس طرح کا کوئی حکم اسلامی دور میں ناممکن ہے، قرآن و حدیث میں غیر مسلم رعایا پر ختیوں کی اتنی شدید ممانعت ہے کہ آج بھی روشن خیال سے روشن خیال مغربی ملکوں کو وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ ایک بہت ہی چھوٹی چیز کو بطور نمونہ

بیان کر کے ہم اس ذکر کو ختم کریں گے، وہ یہ کہ غیر مسلموں کے قبور تک کو اسلامی حکومت میں چھپڑا نہیں جا سکتا، اور اس کو ذمیوں کے حقوق کی خلاف ورزی شمار کیا جائے گا۔ جیسا کہ ہر فقہ کی کتاب میں مذکور ہے۔ (مسجد نبوی کی اولین تغیر کے وقت جس عیش قبور کا ذکر ملتا ہے، وہ زمینوں کے متعلق نہیں ہے)

### (۳) قوانین میں باہم تصادم

(الف)۔ اسلامی اور غیر اسلامی قوانین میں تصادم

اگر فریقین مقدمہ میں سے ایک غیر مسلم اور دوسرا مسلمان ہو، اور بناۓ دعویٰ اسلامی سرزین ہی میں پیدا ہوئی ہو تو مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہوگا اور عام طور پر اسلامی قانون کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے گا، اس سلسلہ میں دیوانی مقدموں کی حد تک کچھ زیادہ دشواری نہیں، لیکن فوجداری مقدموں میں چند استثناء اور شرائط پائے جاتے ہیں، جو زیادہ تر غیر مسلم افراد کی سہولت کے لئے ہیں، مثلاً چند افعال، شراب نوشی، محروم عورتوں سے نکاح، اور اسی طرح کے امور کا ارتکاب اگر غیر مسلم کریں تو کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا، دوسرے قتل انسان کے سلسلے میں اگرچہ بعض ائمہ کی یہ رائے ہے کہ مسلمان قاتل سے جب مقتول غیر مسلم ہو، قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اسے صرف خون بہا ادا کرنا ہوگا۔ لیکن حنفی مذهب میں مسلمان اور غیر مسلم رعیت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، ایک حدیث نبوی بھی اس رائے کی تائید میں ہے لیکن حنفیوں کے نزدیک بھی اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم متامن یعنی اسنے کر آنے والے انجبی کو قتل کر دے، تو مسلمان سے قصاص نہیں لیا جائے گا، مگر حنفیوں میں بھی اس پر پورا اتفاق نہیں ہے، اور ان کے ایک ممتاز فرد یعنی امام محمد بن شیبانی یہ رائے رکھتے ہیں کہ غیر مسلم متامن جب تک امان اور اجازت لے کر اسلامی سرزین میں مقیم رہے اس وقت تک وہ حقوق اور واجبات میں ذمیوں کے برابر ہوگا، اس اصول کے ماتحت متامن کے قتل پر بھی مسلمان قاتل سے قصاص لازم آتا ہے۔

اسلامی اصول قانون اختیار ساعت کے متعلق بہت شدت رکھتا ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان جو اسلامی مملکت کی رعیت بھی ہو بیرون ملک میں قتل کر دیا جائے یا لوٹ لیا جائے یا کسی اور طریقہ پر اسے کوئی ناجائز نقصان پہنچایا جائے، اور جرم غیر مسلم ہو اور مقام جرم بھی غیر مسلم علاقہ ہو جہاں وہ مسلمان جائز اغراض کے لئے وہاں کی حکومت کی اجازت اور رضامندی سے گیا ہوا

ہو، اور پھر وہ مجرم اسلامی سرزین کو اجازت لے کر آئے تو بھی اسلامی سرزین کی کسی عدالت میں اس کے خلاف اس بارے میں کوئی مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ فقهاء کا استدلال یہ ہے کہ بنائے ناٹش کی ابتداء چونکہ ایسے مقام پر ہوئی جہاں اسلامی اختیار ساعت نہیں پایا جاتا تھا، اس لئے اسلامی عدالتیں اس مقدمہ کی ساعت کی مجاز نہیں، جیسا کہ سرضی نے (مبسوط ۹۵/۱۰ تا ۹۷ میں) لکھا ہے، خود رسول کریم ﷺ کا بھی ایک اور ارشاد وارد ہوا ہے کہ:

اذا هرب الرجل وقد قتل أوزنی او سرق إلى العدو ثم أخذ أمانا على نفسه فإنه يقام عليه ما فرمته و اذا قتل في ارض العدو وزنى او سرق ثم اخدا مانعا لم يقم عليه شيئا مما احدث في ارض العدو، (شرح السیر الكبير جلد نمبر ۳ ص ۱۰۸، عن عطية ابن قيس الكلايبي ان رسول الله ﷺ قال)

جو کوئی (ہماری سرزین میں) قتل یا زنا یا چوری کا ارتکاب کرے اور فرار ہو جائے لیکن پھر اجازت و امان لے کر واپس آئے تو اس پر مقدمہ چلا کر اسے اس چیز پر سزا دی جائے گی جس سے بھائی کی اس نے کوشش کی تھی لیکن اگر اس نے قتل یا زنا یا چوری کا ارتکاب دشمن کے علاقہ میں کیا تھا، اور پھر اجازت لے کر (ہمارے ہاں) آئے تو اسے اس جرم کی جواب دی کرنی نہیں پڑے گی، جس کا ارتکاب اس نے دشمن کی سرزین میں کیا تھا۔

### (ب)۔ دو غیر مسلم قوانین میں تصادم

اگر فریقین مقدمہ دو الگ الگ غیر اسلامی ملتوں سے تعلق رکھتے ہوں مثلاً ایک یہودی ہو اور دوسرا عیسائی تو اسلامی عدالت میں اس پر توجہ نہیں کرتی کیونکہ مسلمان فقهاء کی رائے کے مطابق جملہ غیر اسلامی ملتوں ایک ہی وحدت کی حیثیت رکھتی ہیں، امام ابوحنیفہ کے الفاظ میں اهل الشرک کلهم ملة واحدة اور امام محمد شیبانی کے الفاظ میں الكفر ملة واحدة وکیم کتاب الاصل، امام محمد شیبانی کے ۱۳۲ تا ۱۳۱ مخطوطہ کتب خانہ عاطف، استنبول) لیکن اگر مختلف الادیان فریقین مقدمہ اس پر باہم متفق نہ ہو سکیں کہ ان دونوں میں سے کس کی ملی عدالت میں مقدمہ چالایا جائے تو پھر اسلامی عدالت کو مقدمہ کی ساعت کر کے فیصلہ کرنا ہوگا جیسا کہ مشہور مالکی امام خلیل نے بیان کیا ہے، اس بارے میں دیوانی اور فوجداری مقدموں میں کوئی فرق نہیں، یہ معلوم نہیں کہ مسلمان قاضی کا فیصلہ اس صورت میں کیا ہوگا، جب کہ نزاع مثلاً کسی قرض کے متعلق ہو، جس میں سود دینے کا اقرار ہو، یا کسی بیع کے

متعلق اور شراب مہیا کرنے کا اقرار ہو، چونکہ سود اور شراب اسلام نے منع کر دیئے ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ فریقین مقدمہ کے ادیان نے بھی ان کو منوع قرار دیا ہواں لئے پیچیدگی پیدا ہوگی۔

### (ج)۔ دو اسلامی مذاہب نسبت میں تصادم

اسلامی مذاہب فقہ متعدد ہیں، اگر فریقین میں سے ایک سنی اور دوسرا شیعہ ہو، بلکہ خود دونوں کے سنی ہوتے ہوئے بھی ایک حنفی اور دوسرا شافعی ہو تو متعدد مسائل میں تصادم قوانین وقوع میں آ جاتا ہے، اور اس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ قاضی کس فریق کے مذہب کے مطابق حکم صادر کرے، عہد نبوی اور ابتدائی خلفاء کے زمانہ میں اس طرح کا تصادم عملًا پایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جلد ہی اختلاف رائے کی صورتیں فتحاء میں پیش آنے لگیں صحابہ کے دور میں بھی اور اس کے بعد بھی لیکن چونکہ اس وقت تک قاضیوں پر اس کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ کسی خاص فقیہ کی رائے کی تقلید کریں، بلکہ قاضی خود اپنی مستقل حیثیت رکھتے تھے اور اپنے ذاتی اجتہاد کے مطابق فیصلہ کرنے کی پوری آزادی رکھتے تھے، اور اس کا نفاذ بھی کرایا کرتے تھے، اس لئے یہ سوال فتحاء کے اختلاف رائے کے باوجود پیدا نہیں ہوتا تھا، اور یہاں تک ممکن تھا کہ دارالخلاف کے صدر قاضی کا فیصلہ الگ ہو اور اسی زمانہ میں یا اس کے بعد کسی ضلع یا علاقے کے قاضی کا فیصلہ الگ ہو، لیکن عبادی دور میں اس کا واضح ذکر ملتا ہے کہ امام ابو یوسف نے جو قاضی القضاۃ تھے، اپنے ماتحت افران عدالت کو مامور کرتے وقت یہ ضروری قرار دیا تھا کہ وہ حنفی مذہب کے ہوں، بعد کے زمانوں میں پوری مملکت میں ایک ہی قانون ہونے کی ضرورت تسلیم کرتے اور باقی رکھتے ہوئے بھی تقرارات کے لئے ایک حل نکالا گیا تھا۔ چنانچہ یاقوت نے تجمیع البلدان میں لکھا ہے کہ بعض اوقات خلافت عبادیہ میں زیدی شیعوں کو بھی قاضی مقرر کیا جاتا رہا، لیکن وہ مذہب السلطان یعنی حنفی مذہب کے مطابق فیصلہ صادر کرنے کے پابند تھے۔

۲۔ اسلامی مذاہب فقہ میں تصادم کا مطلب واضح کرنے کے لئے بعض مثالیں شاید مفید ہوں، فرض کرو کہ ایک شخص مرتا ہے اور اپنے قریبی رشتہ داروں میں ایک بھتیجا اور ایک نواسا چھوڑے تو حنفی قانون وراثت کی رو سے پورا ترکہ بھتیجے کو ملے گا اور نواسا بالکل محروم رہے گا لیکن اگر شیعہ قانون وراثت کے مطابق فیصلہ صادر کیا جائے تو نتیجہ بالکل الٹا ہو گا یعنی پوری جائیداد نواسے کو ملے گی اور بھتیجا محروم رہے گا اور یہ صورت آسانی ممکن ہے کہ وراثت اور سورث الگ الگ مذاہب فقہ کے چیزوں ہوں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے والے کے مذہب کے مطابق فیصلہ کیا جائے یا

وارثوں کے مذهب کے مطابق یا اگر وارثوں میں بھی اختلاف مذاہب ہو تو کس وارث کے مذهب کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں قاضی اس امر کے پابند ہیں کہ سرکاری مذهب کے مطابق ہی فیصلہ صادر کریں، (خواہ فریقین مقدمہ کا مذهب کچھ ہی کیوں نہ ہو) تو دشواری نہیں پیدا ہوتی، لیکن اگر حکومت زیادہ روادار اور فراخ دل ہو، اور ہر فرد رعیت کو اس کا حق دیا گیا ہو کہ اس کے مذهب کے مطابق اس کے حقوق اور واجبات معین ہوں، خاص کر ان معاملات کے متعلق جنہیں آج کل مسائل شخصی کہا جاتا ہے، یعنی نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ تو واقعی تصادم قوانین پیدا ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر سلطان صلاح الدین اعظم کے زمانے میں مصر میں وقت واحد میں چاروں سنی مذاہب کی عدالتیں اور چار چار قاضی القضاۃ پائے جاتے تھے، یعنی شافعی، حنفی، مالکی، اور حنبلی، لیکن اس انتظام سے بھی دشواری حل نہیں ہوتی۔ فریقین مقدمہ ایک ہی مذهب کے پیرو ہوں تو یہ انتظام کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک فریق مثلاً شافعی اور دوسرا حنفی ہو تو بہت سے مسائل میں تصادم باقی رہتا ہے، قدیم فقهاء اس کا شاز ہی کہیں ذکر کرتے ہیں، بعد کے زمانہ میں البتہ یہ قرار دے دیا گیا کہ مدعا علیہ اور متوفی ہی کے مذاہب کا لحاظ کر کے فیصلہ صادر کیا جائے گا۔ حنفی، شافعی اور مالکی ملکتوں میں بھی چیز مردوج ہے۔ برطانوی ہند میں بھی اسی کو قبول کر لیا گیا ہے تو نس اور شام و مصر میں بھی اسی پر عمل ہے۔

ہندوستان اور بعض دوسرے اسلامی ممالک میں اس کے موقع پیش آتے۔ رہتے ہیں کہ حکمران اپنا مذهب بدل دیں اور سنی سے شیعہ یا شیعہ سے سنی ہو جائیں لیکن تاحال میری تلاش اس امر کے متعلق ناکام رہی ہے کہ اس کا پتہ چلایا جائے کہ مذهب کی اس تبدیلی سے عدل گستربی پر کوئی اثر پڑا یا نہیں۔

#### (د)۔ تبدیل دین کے باعث تصادم قوانین

اگر میاں بیوی دونوں ایک ساتھ اسلام قبول کر لیں تو ان کا سابقہ عقد نکاح برقرار رہتا ہے۔ بشرطیکہ اسلامی قانون کے تحت وہ روا رکھا جا سکتا ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو مثلاً اگر میاں بیوی خویز و گذس پر عمل کرنے والے پارسی ہوں اور بھائی بہن نے یا باپ بیٹی نے آپس میں نکاح کر لیا ہو یا لاندھب لوگوں نے چار سے زیادہ بیویوں سے ایک ساتھ نکاح کر رکھا ہو یا مهر کے بغیر نکاح کیا ہو، یا ملینبار کے نام، اور نیلگری اور تہت کے باشدے جو تعدد شوہران پر عامل ہوں، اور میاں بیوی ایک ساتھ اسلام قبول کر لیں تو ظاہر ہے کہ ان کا نکاح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، پارسی بیوی کو فوراً

اس کے شوہر سے تفریق کرا دی جائے گی، تعدد ازدواج پر عامل شوہر چار بیویاں رکھ کر بقیہ سے بے تعلق ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ بے مہر نکاح کرنے والی عورت کو مہر کا حق حاصل ہو جائے گا، تعدد شوہر ان پر عمل کرنے والی عورت کو جملہ شوہروں سے (بجز اپنے منتخب ایک کے؟) علیحدگی اختیار کرنا پڑے گی۔

اسی طرح اگر صرف شوہر اسلام قبول کرے، اور بیوی نہ کرے، تو معاملہ میں اچھی خاصی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر بیوی اہل کتاب سے مثلاً عیسائی یا یہودی ہو تو شوہر کے اسلام لانے اور کتابیہ بیوی کے اپنے دین پر قائم رہنے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور ان کا سابقہ ازدواج برقرار رہے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مظہر دور میں ہندوستان میں ہندوؤں کو بھی اہل کتاب تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور ان سے مسلمان مرد خاص کر ٹھیک اور بادشاہ بڑی کثرت سے شادیاں کرنے لگے تھے اور اس کا واضح ذکر ہتا ہے کہ انکی متعدد ہندو بیویاں اپنے مذہب پر رہیں اور ان کے پوچاپ کے لئے شایع مخلات میں مندرجہ غیر کئے گئے۔

لیکن اگر بیوی کتابیہ نہ ہو تو اس سے خواہش کی جائے گی کہ مسلمان شوہر کی زوجیت میں رہنے کے لئے تبدیل مذہب کرے، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے بجائے عیسائی یا یہودی بن جائے لیکن اگر وہ اسلام لانے اور کتابیہ بننے دونوں سے انکار کرے، تو تفریق کرا دی جائے گی۔

اگر صرف بیوی اسلام قبول کرے تو شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا کہ تین مہینوں کے اندر وہ بھی اسلام قبول کر لے (اور اس مدت میں تعلقات زنان شوئی غالباً برقرار نہیں رکھے جاسکیں گے) اگر شوہر تبدیل دین سے انکار کرے تو تفریق میں آ جائے گی۔

ظاہر ہے کہ اگر مسلمان شوہر کی کوئی یہودی بیوی مثلاً عیسائیت قبول کر لے تو اس کا اثر ازدواج پر نہیں پڑتا، کیونکہ عیسائیت اور یہودیت دونوں اسلام کے نزدیک بیوی میں گوارا کئے جاسکتے ہیں۔

## (۲)۔ مسلمان رعایا یا بیرونی ممالک میں

(الف)۔ کسی دوسری اسلامی مملکت میں

قدیم زمانہ میں بظاہر اس کو زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی کہ مسلمان کہاں کا رہنے والا ہے، اگر وہ محض اتنا ہی ارادہ کر لیتا کہ دو ہفتون تک قیام کرے گا تو وہ مقامی باشندہ بن جاتا اور مسلمانوں کو سفر کے دوران میں نماز کے قصر کرنے وغیرہ کی جو رعایتیں ملتی ہیں، ختم ہو جاتیں۔

مشہور سیاح ابن جبیر نے البتہ بیان کیا ہے کہ اس نے قاہرہ میں دیکھا کہ سلطان صلاح الدین اعظم نے مغرب (یعنی تونس و مراس) کے باشندوں کے لئے جو مصر میں مقیم تھے، ایک عریف ان ہی میں سے مقرر کیا تھا جو اپنے ہم وطنوں کے مقدموں میں فیصلہ کرتا تھا، ابن جبیر نے اس رعایت پر بڑی تعریف کی ہے اور میرے علم میں ایک اسلامی ملک کے مسلمانوں کے لئے دوسرے اسلامی ملک میں مراعات خصوصی کی یہ واحد مثال ہے۔

موجودہ زمانہ میں البتہ سیاسی قویت اثر انداز ہو گئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپی ملکتوں یہ گوارا نہیں کرتیں، ان کی سلطان رعایا کسی اسلامی ملکت میں جائے تو اپنے آپ کو اس یورپی ملک کی سیاسی رحیمت کے سوا کوئی اور حیثیت دے، اب تو این سعود کی سی قدامت پسند و رائج الحقیدہ حکومت میں بھی قوانین قویت نافذ ہو گئے ہیں اور ان مسلمانوں پر نافذ ہوئے ہیں جو سعودی عرب کی رحیمت نہنا چاہیے ہیں۔ ایمان، ترکی، افغانستان میں تو عرصہ دراز سے سیاسی قویت کے لئے قواعد پاسئے جاتے ہیں۔ البتہ وحدت و ایسا کو اسلام نے جس قدر محکم کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بدنام ترکی میں بھی اپنی مسلمانوں کے ساتھ اتنی محبت کا سلوک ہوتا ہے کہ دیکھنے والے ریک کرتے ہیں اور یہ بیان میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر دے رہا ہوں۔

### (ب)۔ مسلمان جو غیر اسلامی ممالک میں ہوں

پرانے زمانہ میں مسلمانوں کو بہت سے ملکوں میں خارج الارضی مراعات خصوصی حاصل رہے ہیں، اس سلسلے کا آغاز ان مہاجرین جبش سے ہوتا ہے جنہوں نے عہد نبوی میں مکہ سے جبشت کی تھی، اور تقریباً بارہ سال تک نجاشی کے ملک میں مقیم رہے، مراعات خصوصی مسلمانوں کو قدیم چین، ترکستان، ملیپار (جنوب مشرقی ہند) اور دوسرے بہت سے ملکوں میں حاصل رہے ہیں۔

اس موضوع پر میں نے مجلہ عثمانیہ ۱۹۲۳ء میں ایک مقالہ لکھا ہے اس کی تفصیل کو دہراتے کے بجائے اس کا حالہ دے دینا کافی معلوم ہوتا ہے، ان مراعات کا مثلاً اس زمانہ میں زیادہ تر یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف عبادت کی آزادی حاصل رہے بلکہ ان کے آپس کے معاملات ان کے اپنے قانون کے مطابق ٹے ہوں، جس کے لئے ان کا حاکم عدالت ان ہی میں سے چنا جاتا تھا۔ بعض اوقات تو فریقین ہی نہیں، بلکہ صرف ایک فریق کے مسلمان ہونے کے صورت میں بھی مقدمہ مقابی سرکاری عدالت کی جگہ اسلامی عدالت میں پیش ہو کر اس کا فیصلہ ہوتا تھا لیکن مسلمانوں کے لئے یہ

مراعات حکر انوں کے ذاتی روحانیات کے مطابق گھستے بڑھتے رہتے تھے، اگر ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ رعایتیں ہوتی رہیں تو ناروا سلوک کی مثالیں بھی کم نہیں۔ اس سلسلہ میں مورخ مسعودی نے ایک عجیب و دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ علاقہ خزر میں (جو آج کل انگریزی میں کپین کہلاتا ہے) ایک خاص مقام کے کسی غیر مسلم حکر ان نے مسلمانوں کو اپنی فوج اور اپنی ذات کے محافظ دستے (بادی گارڈ) کے طور پر بھرتی کیا تھا، اور اپنے ملک میں ملی عدالتوں کا ایک وسیع نظام قائم کیا تھا۔ چونکہ اس کی رعایا میں مختلف ادیان و ملل کے لوگ تھے، اس لئے ملی عدالتیں اور ملی حکام بھی مختلف تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے، مسعودی نے جو خاص دلچسپ بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی دوسرے ملی حکام عدالت کو کسی مشکل مسئلہ سے سلبیقہ پڑتا جس کا حل ان کے پاس نہ ہوتا تو وہ اسلامی عدالت سے رجوع کرتے اور اسلامی قانون کا اس بارے میں جو فیصلہ ہوتا اس کو قبول اور نافذ کرتے۔ دیکھو مردوں الذهب جلد ۲ ص ۱۰ تا ۱۲، طبع یورپ) میرے خیال میں اس ملک کے بین الملل قانونی تصادمات ایسے چیزوں ہوں گے جن کو ناقابل حل سمجھ کر مسلمان حکام عدالت سے استصواب کیا جاتا ہوگا اور ان کی ناطرفداری اور علیت کے باعث ان پر اعتقاد کیا جاتا ہوگا۔

### خاتمه

ذکر نہیں کیا جائے گا کہ تصادم قوانین کے متعلق مسلمان فقهاء کا خیال اور عمل ایک ایسا میدان ہے جس میں ابھی تک کسی نے قدم نہیں رکھا ہے، اور اس میں تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے، اور صبر و تحمل سے محنت اور جلاش کرنے والوں کے لئے اس میں بڑی دلچسپ دریافت کی امید کی جا سکتی ہے۔

آخر میں اس تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ علامہ ابن القیم نے "احکام اہل الذمة" کے نام سے ایک صحیح اور دلچسپ کتاب لکھی تھی، اس کی پہلی جلد جو چھ سو صفحوں سے زیادہ پر مشتمل ہے، حیدر آباد میں دستیاب ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کتنی اور جلدیں تھیں، کتاب خانہ ہائے عالم کی جتنی فہرستیں دستیاب ہوتی ہیں ان میں سے کسی میں اس کا ذکر نہیں ملا ہے۔ حتیٰ کہ ابن القیم کی سوانح عمریاں بھی اس تالیف کے ذکر سے ساکت نظر آتی ہیں، لیکن انداز اور اسلوب مجھے بالکل ابن القیم ہی کا سا نظر آتا ہے، اس میں ہمارے موضوع پر کافی مواد موجود ہے۔ کاش مکمل کتاب دستیاب ہو جائے۔ اگر ناظرین میں سے کسی کو اس کے متعلق کچھ پہنچے چلے تو اس کے سنبھال کا اشتیاق یقیناً مجھے بھی رہے گا اور دوسرے اہل علم کو بھی۔



